(غلام گردش)

سوال کے متعدد صحیح جواب ہو سکتے ہیں!

قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ لندن کے نزدیک برائٹن اس درجہ خوبصورت علاقہ ہوگا۔ اکثریت کی طرح ہمیشہ لندن ہی کو یو کے سمجھ کر آنا جانا لگا رہا۔ مگر اب تھوڑے عرصے سے جانہیں پایا۔ اسکی سب سے بڑی وجہ دنیا کے تقریباً ہر کونے میں جانے کے بعد عجیب یکسانیت کا احساس ہے۔ اب تو دنیا کے بڑے شہروں میں عمارتیں اور شاپنگ مالز بھی تقریباً ایک جیسے ہیں۔ چین سے لیکر آسٹریلیا تک، جنوبی افریقہ سے لیکر ملیشیا تک اور امریکہ سے لیکر ماسکو تک۔ شدید یکسانیت جو آپکے ذہن کو گرفت میں لیکر بوجھل کر ڈالتی ہے۔ ایک جیسے ہوٹل، جعلی کمرشل مسکراہٹیں اور وہی پیسہ حاصل کرنے کی شدید خواہش۔ ایک مشکل جذبہ جسکو غلبہ پاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، دولت کا جلد از جلد حصول اور ذہنی انتشار ہے۔ اب یہ وباء ہمارے جیسے ملکوں کو بھی اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔ ہمارے ملک میں زیرِ زمین نہیں بلکہ غالب طرزِ تمدن صرف اور صرف پیسے کا حصول ہے۔

برائٹن پہنچنے سے پہلے اندازہ نہیں تھا کہ خان صاحب بھی ساتھ ہیں۔ اصل نام بھول چکا ہوں۔ وزارت صحت میں شائد جائنٹ سیکرٹری تھے۔ خان صاحب سے لگتا ہے کہ وہ پٹھان ہیں مگر انکا صرف حلیہ پٹھانوں سے ملتا جلتا تھا۔ ویسے وہ لاہور شہر کے رہنے والے تھے۔ خالص پنجابی بلکہ خالص لاہوری۔ باریش داڑھی۔ کُرتا شلوار، واسکٹ اور سر پر کڑھی ہوئی ٹوپی۔ ائیر پورٹ پر اندازہ ہوا کہ مذہبی انسان ہونے کے ساتھ ساتھ پیر فقیر بھی ہیں۔ ائیر پورٹ پر تین چار لوگ پرانے سے پھولوں کے ہار لیکر کھڑے نظر آئے۔ فوراً پیچھے دیکھا تو کوئی ایسی شخصیت نظر نہ آئی۔ آگے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ہار دراصل خان صاحب کے استقبال کیلئے ہیں۔ اپنی کم مائیگی بلکہ کم حیثیت پر خاصہ تعجب اور حیرت ہوئی۔ ویسے لکھاری کی ہمارے ملک میں کسی قسم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا ادیب، شاعر اور فن کی معراج پر پہنچنے والا انسان بھی مالی اعتبار سے معمولی سی زندگی گزار پاتا ہے۔ کیونکہ پارٹ ٹائم لکھاری ہوں اسلیے قدرے آسودہ حال ہوں۔ لندن ائیر پورٹ سے برائٹن تک بڑی آرام دہ بسیں چلتی ہیں۔ ہماری طرح کا حساب نہیں۔ لوگ کافی تمیز سے عوامی سواری پر سفر کرتے ہیں۔ ہم پانچ یا شائد چھ پاکستانی افسر تھے۔ لمبے سفر سے کافی تھکے ہوئے۔ پر حضرت صاحب جیسے ہی بس کی سیٹ پر بیٹھے، فوری طور پر گہری نیند میں چلے گئے۔ خراٹوں کی آواز سے تمام مسافر محضوظ ہونے لگے۔ جب صاحب کو اپنے خراٹے خود سنائی دیتے تھے تو ہڑ بڑا کر اُٹھ جاتے تھے۔ فوراً دوسروں سے پوچھتے تھے کہ خیریت، کیا ہوا۔ میری طرف غور سے کیوں دیکھ رہے ہو۔

برائٹن بہت نایاب شہر ہے۔ سمندر کے ساحل پر لہروں کو پہچانتا ہوا شہر۔ سمندر کے کنارے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے بنے ہوئے انتہائی معیاری ہوٹل ہیں۔ اسی طرح کے ایک ہوٹل میں سرکاری سطح پر بکنگ ہوئی تھی۔ سامان لیکر کمرے تک پہنچا تو کمرہ کافی چھوٹا سا تھا۔ بس شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ ریسپشن پر کمرہ بدلنے کا کہا تو بالکل متصل بڑا سا کمرہ مل گیا۔ اسکی تمام کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی تھیں۔ جھاگ سے بھری ہوئی نیلی لہریں، اپنی منفرد آواز میں ساحل پر آتی ہیں۔ شائد یہ انکی صدا ہے یا شائد زندہ پانی کا احساس۔ کمرے میں سمندر کا بھرپور شور تھا۔ ایسے لگا کہ کمرہ بدل کر غلطی کی ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ زندگی بھی ایسے ہی ہے۔ انسانی

زندگی کے مختلف دور بالکل متضاد کمروں کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ ہر نئے کمرے جا کر احساس ہوتا ہے کہ شائد پہلے والا کمرہ زیادہ پُرسکون تھا۔مگر ہر احساس صرف اور صرف بہلاوہ ہے۔ پہلے سے لیکر آخری تک۔ یا شائد آخری سے لیکر پہلے تک۔ایک چیز جو میرے علم میں نہیں تھی، وہ سمندر کے ساحل پر اُڑنے والے سفید پرندوں (Seagull) کی شدید آواز تھی۔کم از کم یہ آواز میرے لیے نئی تھی۔ یہ پرندے انسانوں سے بہت مانوس تھے۔کھلی ہوئی کھڑکی دیکھ کر کمرے میں غور سے کھانے پینے کی اشیاء کو تلاش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔سفید رنگ کے یہ پرندے خوف سے نا آشنا تھے۔ویسے عجیب سی بات ہے کہ مغرب میں پرندے اور جانوروں کی اکثریت انسانوں کو اپنا دوست سمجھتی ہے۔اگر آپ ہائیڈ پارک لندن یا نیویارک کے مین پارک میں سیر کر رہے ہوتے ہیں تو درجنوں گلہریاں، کبوتر اور رنگدار طوطے آپ کے نزدیک آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔کئی بار ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیتے ہیں۔انکا مطالبہ صرف ایک ہوتا ہے کہ کچھ دانہ ڈال دیا جائے۔اگر ہتھیلی پر کوئی کھانے والی چیز رکھ لیں تو پرندے بلاخوف آپکے ہاتھ پر بیٹھ جاتے ہیں۔آرام سے دانہ کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں انسانوں کی طرح پرندے اور جانور بھی خوف میں زندگی بسر کرتے ہیں۔شائد ہم ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے کے ساتھ ساتھ معصوم پرندوں کو ایذا پہنچانا بھی فرض سمجھتے ہیں۔ہم ایک دوسرے کے شر سے ڈرے ہوئے لوگ ہیں۔تمام غیر انسانی مخلوق ہم سے سہمی ہوئی ہے۔

خیر سیگل زور زور سے آوازیں نکالتا ہے۔ یہ زندگی کا احساس بھی ہے۔صبح صبح ہم سارے کلاس میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ متعدد ملکوں کے سرکاری ملازم اس کورس پر آئے ہوئے ہیں۔تیس پینتیس کے لگ بھگ لوگ۔ایشیاء، افریقہ اور یورپ، تقریباً ہر خطے کی نمائندگی تھی۔کلاس روم میں نشستیں روز تبدیل کی جاتی تھیں تا کہ تمام لوگ ایک دوسرے سے بات کریں۔رنگ، مذہب، جلد اور زبان کی قید سے بے نیاز ہو کر مختلف ذہن ایک دوسرے سے سیکھ سکیں۔کلاس روم کافی بڑا تھا۔ ہر ایک کو دوسرے کا معلوم ہو چکا تھا۔جیسے ہی کلاس شروع ہوئی، حضرت صاحب نے فوری طور پر کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ چند منٹ کے بعد پوری کلاس میں خراٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔صورتحال کافی سنجیدہ اسلیے بھی تھی کہ اس وقت صبح کے صرف نو بجے تھے اور میری معلومات کے مطابق "صاحب "پوری رات مکمل آرام کر چکے تھے۔خاتون پروفیسر نے مسکراتے ہوئے صاحب کو جا کر اُٹھایا۔اور واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھونے کیلئے التجا۔ یہ ترکیب قطعاً کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ایک ماہ کے کورس پر خان صاحب وقتاً فوقتاً موقعہ محل دیکھے بغیر سو جاتے تھے۔کئی سرکاری کھانوں اور تقریبات پر بھی صورت حال یہی رہی۔اب یہ ہمارے فرائض میں شامل ہو چکا تھا کہ جیسے ہی خراٹوں کی آواز آئے، فوری طور پر صاحب کو جگا دیا جائے۔ویسے یہ فریضہ اکثر خاکسار ادا کرتا رہا۔

صبح سے لیکر شام تک دوبارہ طالبعلم بننے سے پہلا فائدہ یہ ہوا، کہ پتہ چلا کہ مجھے کچھ نہیں پتہ۔یعنی سرکاری نوکری نے نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ ذہنی طور پر بھی بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ پروفیسر صاحبان کی کثیر تعداد سب سے پہلے بتاتی تھی کہ آپ لوگ اپنے اپنے ذہنی دروازے کھولنے کی کوشش کریں۔ سننے میں تو بہت آسان لگتا ہے۔ پر انتہائی مشکل کام ہے۔ذہنی تعصّبات کو کم کرنا انتہائی دشوار مرحلہ ہے۔ پورے ایک ہفتہ کے بعد اس قابل ہوا کہ اپنے تعصّبات پر برف کی سِل رکھ سکوں۔کبھی ناکام ہو جاتا تھا اور کبھی کامیاب۔اکثر ویسے

ناکام ہی رہتا تھا۔زندگی میں آپ جس معاشرے میں رہتے ہیں، اس طرح کے سانچے میں سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔اس طرح رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایک فطری سا عمل ہے۔مگر جن ملکوں میں Pluralism ہے، وہاں ہر انسان کی ذہنی،فکری اور سماجی ساخت جدا جدا ہے۔اس معاملہ میں نیویارک جانا ہمیشہ ایک اچھوتا تجربہ ہوتا ہے۔جے۔ایف۔کے ائیر پورٹ پر ہی تمام قومیتیں پگھل سی جاتی ہیں۔امیگریشن ہونے تک کے بیس پچیس منٹ میں دنیا کے ہر ملک سے آئے ہوئے لوگ ایک دم مختلف سے ہو جاتے ہیں۔اگر آپ حقیقت میں کسی ایسے خطے کو دیکھنا چاہتے ہیں، جہاں ہر مذہب اور ملک کے لوگ موجود ہیں۔آپس میں سکون سے رہ رہے ہیں،تو بالخصوص نیویارک اور لندن بے مثال شہر ہیں۔حیرت انگیز حد تک اپنائیت والے خطے۔ایک احساس پہلی بار ہوا، کہ ہم لوگوں میں تجسس،تنوع اور بین النسل سماجی تجربہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ایک خاتون پروفیسر نے ذاتی زندگی کے متعلق بتایا، کہ ملیریا بخار اور مچھروں کے خاتمے کیلئے اپنی زندگی وقف کر چکی ہے۔افریقہ کے دور دراز ممالک میں جا کر مقامی لوگوں کو ملیریا سے محفوظ رہنے کا قرینہ سمجھاتی ہے۔اسکے بقول، دنیا میں کسی بھی جنگ یں اتنی اموات نہیں ہوئیں، جتنی صرف اور صرف ملیریا کی وجہ ہو پائی ہیں۔ہم لوگوں کی اکثریت اس طرز فکر پر زندگی نہیں گزارتے۔بہت کم لوگ ذاتی سطح کے تعصب سے اُٹھ کر دوسرے ملک میں لوگوں کی مدد کو اپنا شعار بناتے ہیں۔بہت کم لوگ نہیں، بہت ہی کم لوگ۔شائد یہ لفظ بھی معقول نہیں۔اپنی پوری زندگی میں اب ایک بھی شخص ایسا نہیں ملا جو رنگ،نسل اور مذہب کی قید سے اُٹھ کر ہر ملک میں خدمت کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ایدھی اور ان جیسے نصب درج لوگ پھر بھی غنیمت ہیں۔دوسرے پروفیسر نے بتایا کہ وہ برطانیہ میں شہر میں رہنے کے خلاف ہے۔ہمیشہ دیہات میں رہنا پسند کرتا ہے۔برائٹن سے چالیس میل دور ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتا تھا۔روزٹرین پر اپنے گھر جاتے ہوئے بیس منٹ لگ جاتے تھے۔مگر اسکے بقول برائٹن جیسے شہر میں رہنا بھی مناسب نہیں۔مجھے برائٹن کی آبادی کا علم نہیں۔مگر دو تین لاکھ سے کیا زیادہ ہو سکتی ہے۔مگر اس پروفیسر کے نزدیک یہ بھی ایک بے ہنگم ہجوم ہے۔اسے لاہور یا کراچی رہنا پڑ جائے،تو شائد اتنی زیادہ آبادی دیکھ کر گوشہ نشینی اختیار کر لے یا شائد صوفی بن جائے۔

ایک ماہ کے اندر بہت کچھ سیکھا۔مگر ایک بات انتہائی اہم تھی۔ایک خاتون پروفیسر نے کلاس میں سوال اُٹھایا۔سب نے اپنی اپنی دلیل سے جواب دیا۔آپس میں متضاد اور مختلف جواب تھے۔آخر میں پروفیسر کا نقطہِ نظر انتہائی اہم تھا۔کہنے لگی کہ کسی بھی سوال کا صرف ایک صحیح جواب نہیں ہوتا۔اسکے متعدد درست جواب ہو سکتے ہیں۔جملے نے میرے ذہن کی ایک بند کھڑکی یک دم کھول دی۔اگر ہم صرف ایک نکتہ سمجھ جائیں، کہ ایک سوال کے متعدد صحیح جواب ہو سکتے ہیں،تو ہر چیز بدل سکتی ہے۔زیادہ امن،آسودگی اور چین حاصل ہو سکتا ہے۔پر یہاں تو ہر شخص اپنے سوال کو حتمی سمجھتا ہے اور اپنے جواب کو حرفِ آخر۔یہاں ذہنی کیفیت تبدیل ہونے کے کوئی آثار نہیں۔

راؤ منظر حیات